© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۳)

از سعید احمد اکبر آبادی

چٹرجی کمیٹی کی رپورٹ یہ رپورٹ جو باریک ٹائپ کے ایک سو چوالیس مطبوعہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے بہت مفصل اور مبسوط ہے اور اس میں یونیورسٹی کے ہر شعبہ اور اس کے ہر کام کا جائزہ بڑی تحقیق و تدقیق اور جزئیاتی استیعاب و استقصار کے ساتھ لیا گیا ہے اور اعتراضات کو بے کم و کاست بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کی روشنی میں ایک ایک اعتراض سے متعلق اپنی رائے پیش کی گئی ہے، اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو اہم فیصلے کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مالیات بڑے شد و مد کے ساتھ اعتراض کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی میں لاکھوں روپیہ کا غبن اور خیانت ہے۔ انجینئرنگ کالج کی لاکھوں روپیہ کی مشنری پاکستان منتقل کر دی گئی ہے، معمولی جائدادیں بھاری قیمت دے کر خرید کی گئی ہیں، کمیٹی نے بتایا ہے کہ حسابات کی جانچ پڑتال اور رجسٹروں اور ووچروں کی حفاظت ان کے باقاعدہ اور اپ ٹو ڈیٹ رکھنے اور آڈٹ کے اعتراضات کا بروقت جواب دینے میں غفلت ضرور ہوئی ہے جس کا ایک سبب تقسیم بھی ہے جس نے یونیورسٹی کا پورا نظام زندگی ہی درہم برہم کر دیا اور ایک افراتفری کی کیفیت پیدا کر دی تھی، لیکن آخر میں کمیٹی کہتی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ہم یہ ضرور کہیں گے کہ شروع میں ہم یونیورسٹی کے حساب کتاب کے معاملہ میں حد درجہ غیر مطمئن اور مشکوک تھے، لیکن جب آڈٹ کے اعتراضات ہم نے یونیورسٹی کے ذمہ دار اصحاب کے سامنے پیش کئے اور ان سے جواب طلب کیا تو انھوں نے بڑی جدوجہد اور تلاش کے بعد وہ مطلوبہ رکارڈ فراہم کر لئے جن کے متعلق خیال یہ تھا کہ گم ہوگئے ہیں اور چند ہفتوں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اتر پردیش کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے جو اعتراضات ۱۹۶۱ء کے ماہ ستمبر تک تھے تقریباً ان سب کا تشفی بخش جواب مل گیا ہے اور ہم نے دیکھا کہ رکارڈ صحیح اور جوں کے توں ہیں۔" (ص ۴۸)

اقرباء نوازی اور فرقہ پرستی

اقرباء نوازی اور فرقہ پرستی کے اعتراضات جن کو پارلیمنٹ میں اور فرقہ پرست اخباروں میں بڑے زور شور سے اچھالا گیا تھا۔ کمیٹی نے ان کی بھی تردید کی ہے اور وہاں غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کے ساتھ یونیورسٹی برادری کا جو معاملہ ہوتا ہے اس کی بڑی تعریف کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ "طلباء کا داخلہ" کے زیر عنوان باب ہشتم میں کمیٹی نے یونیورسٹی کی تاریخ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے طریق کار پر بڑی سیر حاصل اور جامع گفتگو کی ہے اور جو کچھ کہا ہے بڑی صفائی سے اور کھلے دل سے کہا ہے، چونکہ یہ باب بہت اہم ہے اور یونیورسٹی کے دستور کے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہم جستہ جستہ اس کے بعض حصوں کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کرتے ہیں:

تاریخ

"اب ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کا جو اصل مقصد تھا اس سے بحث کرتے ہیں، کیونکہ طلباء کے داخلہ کا براہ راست تعلق اسی مقصد سے ہی ہے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جب کبھی طلباء کے داخلہ کا سوال پیدا ہوگا اس پر غور کرتے وقت یونیورسٹی کی تاریخ اور اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر دینا ممکن نہ ہوگا۔ یہ یونیورسٹی عالم وجود میں کیسے آئی؟ یہ سب کو معلوم ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گئی تھی، عظیم مصلح اور مفکر سرسید نے ان حالات کا جائزہ لینے اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمان مغربی تعلیم کے بغیر اس قعر مذلت و پستی سے باہر نہیں آسکیں گے جس میں حالات نے انھیں گرا دیا ہے، ساتھ ہی سرسید کے عقیدہ میں اسلام ایک عظیم ترقی پسند طاقت تھا، اس بنا پر سرسید نے منصوبہ بنالیا کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں کے مسلمان طلبا کو اسلامی مذہب اور اس کی روایات کی بھی تعلیم دی جائے، اس مقصد کے لئے (مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد) انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جس کے افتتاح کی رسم ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو منائی گئی۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں ورود کیا اور کالج کا سنگ بنیاد رکھا، یہ وہی کالج ہے جس کے مقدر میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا مرکز ہونا لکھا تھا، ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال سے پیشتر ہی ہندوستان کے تعلیمی نظام میں اس کالج نے اپنا ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک شروع ہوئی، اس سلسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی، اور آخر ۱۹۲۰ء میں مرکزی حکومت کی مجلس قانون ساز نے ایک ایکٹ پاس کر کے اس کالج کا یونیورسٹی ہونا منظور کر لیا، یہ کالج جو اب یونیورسٹی بن گیا تھا تمام تر پبلک کے چندوں اور ان کے عطیات سے چلتا رہا تھا اور ان عطیات کے دینے والوں میں غیر مسلم بھی شریک تھے۔

آپ نے دیکھا! کمیٹی نے کس صفائی اور جرأت سے اصل حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ (۱) یہ کالج مسلمانوں کے لئے قائم کیا گیا تھا (۲) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ مذہب اسلام اور اسلامی روایات کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا تھا (۳) یہ کالج مسلمانوں کے روپیہ سے بنا تھا گو بعض غیر مسلم بھی ان کے ساتھ شریک تھے (۴) پھر جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنی تو وہ کوئی نئی چیز نہ تھی، بلکہ یہی کالج تھا جس کو اب اس کی اپنی روایات اور خصوصیات کے ساتھ یونیورسٹی کا مرتبہ و مقام دے دیا گیا تھا (۵) چنانچہ جس ایکٹ کی رو سے یہ کالج یونیورسٹی بنا یعنی ۱۹۲۰ء کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ، اس میں اغراض و مقاصد کے زیر عنوان ان سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقائق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایکٹ کا منظور کرنا یا اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کرنا پارلیمنٹ کے واسطہ سے حکومت کے اختیار میں ہے، لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اس بناپر ایکٹ میں کوئی رد و بدل ان کی رضامندی کے بغیر اخلاقاً تو درست ہوگا ہی نہیں، دستور میں اقلیتوں کے تحفظات کی جو دفعہ ہے اس کی رو سے قانوناً بھی معتبر نہیں ہوگا۔

۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بعد جو ملک کے حالات بدلے تو ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بنا۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ ایکٹ مسلمانوں کی مرضی سے بنا۔ کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت وزیر تعلیم تھے اور اس ایکٹ کو جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ اور دوسرے مسلم اداروں نے تسلیم کرلیا، اس کے خلاف نہ کوئی تحریک چلی، نہ احتجاج ہوا، اور نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوا۔ اکادکا کسی اخبار نے کچھ لکھا ہو، یا کسی نے کچھ کہا ہو تو اس کی حیثیت شخصی اور ذاتی رائے کی ہے، اس کو مسلمانوں کی رائے عامہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

ایکٹ ۱۹۵۱ء کی نسبت کمیٹی کی رائے

لیکن سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بدلا یا نہیں؟ اس کے جواب میں کمیٹی نے صاف کہا ہے کہ نہیں بدلا، چنانچہ کمیٹی کہتی ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ان چند اہم ترمیمات کے باوجود جو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں کی گئی ہیں ۱۹۵۱ء کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار قانوناً نہیں بدلا۔ اور حکومت کی روز افزوں مالی امداد سے بھی اس کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیرالا ایجوکیشن بل کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ کیا تھا اس نے قطعی طور پر اس معاملہ کو طے کردیا ہے، فاضل ججوں نے کہا ہے: کوئی تعلیمی ادارہ عملی طور پر گورنمنٹ کی مالی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا، اور اگر امداد کی شرط یہ قرار دی جائے کہ اس تعلیمی ادارہ کو اپنے حقوق سے دست بردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونا پڑے گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دفعہ (۱) 30 کے ماتحت دستور نے اس ادارہ کے لوگوں کو جو حقوق دئے ہیں وہ سلب کئے جا رہے ہیں" اس کے بعد فاضل ججوں نے اس پر بحث کی ہے کہ اگر کسی خاص فرقہ کی تعلیم گاہ میں کسی دوسرے فرقہ کے طلبار کا داخلہ ممنوع نہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اب یہ تعلیم گاہ خاص اس فرقہ کی نہیں رہی طلبار کے داخلہ کے معاملہ میں ایک یونیورسٹی کس درجہ مختار ہے؟ اس سلسلہ میں فاضل ججوں نے مسٹر جسٹس فرینکفرٹر (Mr. Justice Frankfurtar) نے امریکہ کے ایک اسی قسم کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا تھا اس کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ: "یونیورسٹی کے لئے چار چیزوں کی مکمل آزادی ضروری ہے (۱) ایک یہ کہ کون پڑھائے گا (۲) دوسرے یہ کہ کیا پڑھایا جائے گا (۳) تیسرے یہ کہ کس طرح پڑھایا جائے گا (۴) چوتھے یہ کہ کس کو پڑھایا جائے گا۔ یہ چار قسم کی آزادی ہر یونیورسٹی کا بنیادی اور ضروری حق ہے اور ریاست کا فرض ہے کہ ان کا احترام کرے" یہ عبارت نقل کرنے کے بعد جسٹس جی کیمیٹی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی رائج الوقت داخلہ کی پالیسی پر بحث کی ہے اور پھر اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بیشک یونیورسٹی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ہاں کے فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ ڈویژن جن کے نمبر 55٪ ہوں ان کو دوسری جگہوں کے امیدواروں کے مقابلہ میں داخلہ کے معاملہ میں ترجیح دے، علاوہ ازیں جب ایک طالب علم ایک یونیورسٹی میں داخل ہو جائے گا تو اب وہ یونیورسٹی کے گروہ کا ایک مستقل ممبر ہو جائے گا اور اس بنا پر اب اعلیٰ کلاسوں میں داخلہ کے لئے اس کو از سرِ نو جدوجہد نہ کرنی ہوگی۔ جس وقت یہ رپورٹ لکھی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلبار کی تعداد 35٪ تھی اور اس کو کمیٹی نے بہت معقول تعداد قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی میں مستقل طور پر مسلم اور غیر مسلم طلبار کی تعداد کا تناسب بھی مقرر کر دیا جائے تو کسی شخص کو سکولرزم اور جمہوریت کی آڑ لے کر اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیئے، لیکن ساتھ ہی جیسا کہ کمیٹی نے کہا ہے۔ اگر یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہو سکتا کہ اس میں ایرے غیرے نتھو خیرے ہر مسلمان کو داخلہ مل سکتا ہے، بلکہ یونیورسٹی کی عظمت اور اس کے بلند مقاصد کا تقاضا ہے کہ اس میں داخلہ کی شرط کو سخت کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اس میں داخلہ کے لئے فرسٹ ڈویژن یا سکنڈ ڈویژن پچپن فیصدی نمبروں کے ساتھ کی شرط رکھی گئی ہے۔

کمیٹی نے بہرحال یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس یونیورسٹی میں مسلمان طلبار کثرت سے داخلہ لیں گے۔ کیونکہ یہاں مسلمان طالب علموں کے لئے تعلیم، رہائش اور اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق تربیت کی جو سہولتیں اور آسانیاں میسر ہیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں، کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ: ہمارے سامنے جن حضرات نے اپنے بیانات دئے ہیں ان میں متعدد لوگوں کی زبان سے یہ معلوم ہوا کہ دوسری یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبار کو داخلہ بہت کم ملتا ہے۔ کمیٹی نے اس پر اپنے دلی دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے اور گورنمنٹ سے سفارش کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں فوری ضروری اقدام کرے۔

اساتذہ کا تقرر اساتذہ کے تقرر کے ذیل میں کمیٹی نے یونیورسٹی کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ مضمون کی لیاقت و قابلیت اور درس کی صلاحیت میں برابر ہونے کے باوجود یونیورسٹی ایک ایسے شخص کا انتخاب کرے جو علی گڈھ کے ماحول، کلچر اور اس کی روایات سے مانوس ہو۔

کمیٹی نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ فرقہ پرست اخبارات مسلم یونیورسٹی پر بے بنیاد الزامات عائد کر کے اکثریت کے ذہن کو اس کی طرف سے مسموم کر رہے ہیں۔

غرض کہ چھاگلہ کمیٹی کی یہ رپورٹ آزادی اور تقسیم کے بعد مسلم یونیورسٹی کی قانونی حیثیت کو متعین کرنے کی راہ میں ایک مینارۂ روشنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا مقام تاریخی دستاویز کا ہے، وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی جس ڈھب کے آدمی تھے اس کی وجہ سے اسے منظور کرنے کے حق میں نہیں تھے، لیکن گورنمنٹ نے اسے منظور کر لیا۔ یہ اہم دستاویز چونکہ زیدی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عہد میں تیار ہوئی ہے اور یونیورسٹی پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے یونیورسٹی کی طرف سے ان کے معقول اور حقیقت افروز جوابات کے بہم پہنچانے کا کام انہیں کی ان تھک مساعی، بیدار مغزی اور حسنِ انتظام و تدبر کا مرہونِ احسان ہے۔ اس بنا پر اس کا کریڈٹ زیدی صاحب کو ملنا چاہیئے۔

فیکلٹی آف تھیالوجی کی ترقی سرسید نے کالج کے مقصد تعلیمی اعتبار سے دو بتائے تھے (۱) انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم (۲) اسلامی دینیات کی تعلیم، اور درحقیقت دینیات کی تعلیم ہی اس کالج کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت تھی، کیونکہ انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم تو ہر کالج میں ہوتی ہی ہے اور وہ اسی مقصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، اسی طرح عربی فارسی کی تعلیم بھی ہر کالج میں ہوتی، لیکن دینیات کی تعلیم کسی بھی کالج میں نہیں ہوتی، لیکن مسلمانوں کے ذہنی انحطاط اور مذہب کے متعلق ان کے محدود اور تنگ نظریہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مقصدِ اول میں کالج خوب پھلا پھولا یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کی ایک نئی اور عظیم نسل پیدا کی، لیکن مقصدِ ثانی کے متعلق سرسید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ سرسید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا حالی، مولوی طفیل احمد منگلوری اور محمد اکرام ندوی، سب اس پر افسوس کرتے رہے ہیں کہ کالج اور پھر یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کبھی خاطر خواہ اور یونیورسٹی کے شایانِ شان نہیں ہوا۔ یہاں اس مضمون کو نظرِ بد سے بچنے کے تعویذ سے زیادہ کبھی کوئی اہمیت نہیں ہوئی، اس مضمون کا درس دینے والوں کا احترام ہوتا تھا! لیکن ٹھیک ٹھیک وہ احترام جو ایک کلکٹر کمشنر یا بیرسٹر بیٹا اپنے بوڑھے، جاہل اجڈ اور دیہاتی باپ یا چچا کا کرتا ہے، اس کا نصاب "راہِ نجات" اور بہشتی زیور کے مسلے مسائل سے آگے نہیں بڑھا۔ اس مضمون کے امتحان میں کامیابی کا معیار اس سے زیادہ نہیں تھا کہ طالب علم نے سورۂ فاتحہ یا کوئی اور سورت جو عام طور پر نماز میں پڑھی جاتی ہے زبانی سنا دی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔[1]

زیدی صاحب کے عہد کو اس حیثیت سے عہد آفریں کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا یہ خواب یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ اس عہد میں اپنی تکمیل کی منزل کی طرف بڑھنا اور سرسبز وشاداب ہونا شروع ہوا اور بارہ برس کی مدت میں وہ یونیورسٹی کے چمن کا ایک شجرِ بار آور بن گیا۔

دینیات کا تصور

لیکن جو کچھ ہوا بے سبب نہیں ہوا، اس کی جڑیں بہت گہری اور دور رس ہیں اور اس کا دار و مدار صرف اس ایک بات پر ہے کہ دینیات کا اصل تصور اور اس کی تعریف کیا ہے؟ قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں پہلے دینیات کا اصل تصور اور اس کی حقیقت معلوم کر لیجئے، بدقسمتی سے عام مسلمانوں کا کیا ذکر! اچھے خاصے لکھے پڑھے اور بہت سے علماء تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اسلام نام ہے چند عبادات اور چند اخلاقی تعلیمات اور چند خاص معتقدات کا، بس یہی چند چیزیں ہیں جو ایمان و کفر کے درمیان ایک حد فاصل ہیں اور ان پر عمل کر لینا انسان کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے اس بنا پر جو چاہے کیجئے، مگر نماز روزہ کی پابندی کرتے رہیئے، خیر خیرات کیجئے، تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو جائیے، کسی ایک بزرگ کا مرید بن کر سب کچھ ان کی خدمت کے لئے وقف کر دیجئے، اور بزرگوں کے مزارات پر جو عرس ہوتا ہے اس میں شریک ہو جیئے، سیرت کے جلسے بلکہ کانفرنسیں بڑی دھوم دھام سے منعقد کرائیے، اور واعظین کرام کو گراں قدر نذرانے پیش کر دیجئے، اگر آپ دولتمند ہیں تو اس سے بحث نہیں کہ دولت کس طرح کمائی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز، بہرحال سال میں کم از کم ایک عمرہ اور ہر برس ممکن نہ ہو تو دوسرے تیسرے برس ایک حج ضرور کرتے رہیئے، بس یہ چند اعمال و افعال ہیں ان کی وجہ سے آپ دنیا میں بھی سرخرو رہیں گے اور

---

[1] دیکھئے پروفیسر حمید الدین مرحوم کا مضمون مجلۂ علوم دینیہ، علی گڑھ ج ۱، نمبر ا میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخرت میں بھی! یہی اسلام ہے اور یہی دین! اب اگر کروڑوں انسان بھوک پیاس سے مر رہے ہیں، جہالت و نادانی کا شکار ہیں، دنیا کے کروروں غریبوں کا خون سرمایہ داری کی جونک چوس رہی ہے، تہذیبِ فرنگ نے انسان کو برہنہ کر دیا ہے اور وہ عریانی و فحاشی کے چوراہے پر کھڑا ننگا ناچ ناچ رہا ہے۔ آمرانہ ذہنیت نے جمہوریت کے دعاوی کے باوجود رنگ ونسل اور مذہب وقومیت کے امتیاز کے بغیر کروروں بندگان خدا کو اپنی سیاست کے شکنجہ میں جکڑ کر زندگی کی ان آسائشوں سے محروم کر دیا ہے جو پروردگار عالم نے ان کے لئے پیدا کی تھی تو یہ سب کچھ ہوا کرے، اگر آج غلط طرزِ فکر، غلط اقدار کی پرستش اور صحیح اقدار حیات سے روگردانی کے باعث انسان کے سر پر قیامتیں اور ہلاکتیں منڈلا رہی ہیں تو ہوں! ایک مسلمان کو ان سے کیا واسطہ! یہ سب تو سیاسی اور دنیوی مشغلے ہیں۔ صلاح و تقویٰ اور طہارتِ نفس کو ان چیزوں سے کیسا تعلق! مانا کہ قرآن میں خدا کو رب العٰلمین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃٌ للعالمین فرمایا گیا ہے، مگر اس کے یہ معنی کہاں ہیں کہ ہمارے لئے مسلمان ہونے کے ناطے دنیا کے تمام انسانوں کی جسمانی اور باطنی، مادی اور روحانی، دنیوی اور اخروی فلاح وبہبود کے لئے وہ تمام کام کرنے ضروری ہیں جو اللہ کی رب العالمینی اور آنحضرت صلی اللہ کے رحمت کونین ہونے کے طبعی مظاہر ہیں، ہم ہر نماز کے بعد اپنی فتح ونصرت اور ظالموں کی تباہی وبربادی کے لئے دعا تو کر لیتے ہیں! تو کیا یہ کافی نہیں ہے، اور کیا اس سے ہمارے خیرِ امم اور امت وسطاً ہونے کا مقتضا پورا نہیں ہوتا؟ ظاہر ہے جب اسلام کا تصور یہ ہو تو اس کی دینیات کا نصاب بھی اسی ذہن کا آئینہ دار ہوگا۔ اس میں نہ وسعت ہوگی اور نہ علمیت، وہ نہ اپنوں کو مطمئن کر سکے گا اور نہ غیروں کو، یہ اسلام دعا، درود، سلام اور منقبت اور تعویذ گنڈے تک محدود ہوگا۔ اور اس میں نہ حرکت کا نشان ہوگا اور نہ علمیت کا۔ اس کا چراغ علم و فن کی آندھیوں میں روشن نہیں رہ سکے گا اور اس کی کشتیِ افکار و آرائے جدیدہ کے طوفان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے صحیح سلامت نہ گذر سکے گی۔

لیکن درحقیقت اسلام کا صحیح تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کا عظیم ترین اور سخت انقلاب آفرین مذہب ہے، اس نے تاریخ کو ایک نہایت اہم موڑ دیا ہے، اس نے انسان کو زندگی اور کائنات کے معاملات ومسائل پر سوچنے اور غور کرنے کا ایک نیا ڈھنگ اور نیا آہنگ دیا ہے، زندگی محدود تھی، اسلام نے اس کو لامحدود بنا دیا۔ کائنات بدوضع اور بے رونق تھی اس نے اسے لالہ زار کر دیا، انسان ڈر اور خوف، مایوسی وناکامی اور احساس ہیچمیرزی کا صیدزبوں تھا۔ اسلام نے اس کی ہمت باندھی، اسے حوصلہ بخشا، اسے جرأت وجسارت عطا کی اور اس کے سر پر کائنات ارض وسما پر حکمرانی وفرمان روائی کا تاجِ زرفشاں رکھا، وہ جامد نہیں ابدی الحرکت ہے، اس کا کوئی ایک میدان نہیں بلکہ انسان کے فکر وعمل کے ہر میدان میں وہ رواں دواں ہے، مذاہبِ عالم، علوم وفنون، فکر ونظر، شعر وادب، سماجیات ومعاشیات سیاست اور حتی کہ فنون لطیفہ اور فلسفہ وحکمت، ان میں سے وہ کونسی چیز ہے جس پر اسلام نے اپنی چھاپ نہ لگائی ہو اور جس کے نقش ونگار میں اپنا رنگ نہ بھرا ہو، یہ اس کے علمی کارنامے تھے، ساتھ ہی اس کا سب سے بڑا عملی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رنگ ونسل، وطنیت وقومیت اور امیری اور غریبی کی تمام حدبندیوں کو ختم کر کے سب کو ایک رشتۂ وحدت انسانی سے منسلک کر دیا اور جو لوگ اسلام کی سچائی پر یقین واعتقاد رکھتے ہیں اور جن کا اصطلاحی نام مسلمان ہے ان کو دنیا کے تمام انسانوں کا محافظ اور نگران مقرر کر کے ان کا یہ فرض قرار دیا کہ دنیا میں کہیں اور کسی جگہ بھی اگر کوئی ایک انسان یا ایک پوری آبادی ظلم اور ناانصافی کا شکار ہے، قحط اور وبا میں مبتلا ہے، اخلاقی انحطاط اور فکری واعتقادی گمراہی میں گرفتار ہے بہرحال مسلمان کو ان سب کی مدد کرنی چاہیئے، گویا ایک مسلمان کی زندگی یہ ہونی چاہیئے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتا ہے اپنا دل
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے یہ ہمہ گیر انقلاب کیونکر پیدا کر دیا؟ جواب یہ ہے کہ اپنے نظام فکر و عمل سے! پس جس کو ہم دینیات کہتے ہیں وہ اسی نظام فکر و عمل کا نام ہے اور چونکہ وہ ہمہ گیر اور نہایت وسیع ہے (جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا) اس بنا پر دینیات بھی اپنے مفہوم میں ایک نہایت وسیع مضمون ہوگا۔ اور بنیادی طور پر وہ مندرجۂ ذیل دو قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہوگا۔

(۱) وہ علوم جن کا تعلق براہِ راست دینیات سے ہے اور جو اس کے لئے اصل ماخذ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان علوم میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ مع اپنی تمام شاخوں اور لوازم و لوائم کے شامل ہیں۔

(۲) وہ علوم و فنون جن کا تعلق بالواسطہ دینیات سے ہے، اس سے مراد وہ علوم ہیں جو (۱) اسلام کے نظام فکر و عمل کو کلاً یا جزءً متاثر کرتے ہیں (۲) یا وہ علوم جن کے ذریعہ اسلام اپنے نظام فکر و عمل کو باختلافِ زمان و مکان لوگوں کے ذہن میں زیادہ راسخ اور موثر طریقہ پر ذہن نشین کر سکتا ہے، علاوہ ازیں اس ذیل میں وہ علوم و فنون بھی آتے ہیں جو اسلام کے نظام فکر و عمل کی کارگزاریاں اور انسان اور اس کے مختلف اداروں پر اس کے اثرات کا مرقع پیش کرتے ہیں، اس بنا پر قسم ثانی میں مندرجہ ذیل علوم و فنون شامل ہوں گے: تاریخ، فلسفۂ تاریخ، منطق و فلسفہ، معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور سائنس۔ مذکورہ بالا دونوں قسموں میں پہلی قسم کے علوم اور ساتھ ہی علوم آلیہ جیسے عربی زبان اور اس کے متعلقات، دینیات کے ہر طالب علم کے لئے لازمی ہوں گے اور قسم دوم کے علوم و فنون کو مختلف گروپ میں تقسیم کر کے ایک طالب علم کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ قسم اول کے علوم کے ساتھ قسم دوم کا جو گروپ چاہے اختیار کر لے۔[۱]

---

[۱] میں نے یہی خیالات اپنے انگریزی مضمون "How to tach Religian" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے نظام فکر و عمل کے سرمایہ میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن اس کے باوجود یورپ اور امریکہ میں کسی یونیورسٹی کے دینیات کالج (College of divinity) کو ملاحظہ فرمائیے! آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کا نصاب مذہبی علوم و فنون کے علاوہ سیکولر علوم و فنون پر اور اس کے مطابق کالج کی لائبریری ہر علم و فن کی کتابوں پر مشتمل ہے[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں ظاہر کئے ہیں۔ کئی سال ہوئے پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ مذاہب کے زیر انتظام پٹیالہ میں ایک سیمینار "مذہب کا مطالعہ کس نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے" کے عنوان پر ہوا تھا، اور میں نے یہ مقالہ اسی سیمینار میں پڑھا۔ اب سیمینار کے دوسرے مقالات کے ساتھ یہ مقالہ بھی کتاب کی شکل میں یونیورسٹی سے شائع ہو گیا ہے

[1] میں نے بھی اپنے زمانہ میں فیکلٹی آف تھیالوجی کی لائبریری کو مختلف علوم و فنونِ جدیدہ پر بہترین کتابوں سے پُر کر دیا تھا، یہاں تک کہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ تعجب کرتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک ناگوار واقعہ بھی پیش آیا جس کا مجھ کو اب تک افسوس ہے، ہوا یہ کہ ایک مرتبہ جناب بشیرالدین صاحب لائبریرین مولانا آزاد لائبریری نے لائبریری میں مختلف شعبہ جات کے صدر صاحبان کی ایک میٹنگ بلائی اور اس میں بطور شکایت کہا کہ بعض شعبوں کے صدر ڈپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے بالا ہی بالا کتابیں خرید لیتے ہیں اور اس کا بل لائبریرین کے پاس ادائگی کے لئے بھجدیتے ہیں، یہ خلاف قاعدہ بات ہے، آپ حضرات کے آرڈر لائبریرین کے واسطہ سے جانے چاہیئے، اسی سلسلے میں انھوں نے مزید کہا کہ بعض حضرات اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے ایسی کتابیں خریدتے ہیں جو ان کے مضمون کی نہیں ہوتیں، یہ کہکر انھوں نے مزید فرمایا: مثلاً فیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین نے برٹرنڈرسل کی خود نوشت سوانح عمری خریدی ہے، بھلا دینیات کو اس سے کیا تعلق؟ یہ سنتے ہی میں فوراً کھڑا ہوا اور ناراضگی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہرحال میں علی گڑھ دینیات کے اسی وسیع تصور کو لے کر آیا تھا اور اسی کے مطابق کام کرنا تھا۔ میں نے جب یہاں اپنے شعبہ کا چارج لیا تو اس کی حالت یہ تھی کہ:

(۱) شعبہ میں صرف دو لکچرر تھے، ان میں سے ایک صاحب ناظم دینیات کا کام کرتے تھے اور ان کا دفتر مسجد کے احاطہ کے اندر ایک کمرہ میں تھا۔

(۲) صدر شعبہ کوئی نہیں تھا، کیونکہ صدر ریڈر سے کم نہیں ہوتا۔

(۳) شعبہ کا اور فیکلٹی کا کوئی دفتر نہیں تھا۔

(۴) اس کا کلرک نہیں تھا۔

(۵) ریڈر اور پروفیسر کی عدم موجودگی میں حسب قاعدہ وضابطہ پرو وائس چانسلر ڈین آف فیکلٹی ہوتا تھا، لیکن پرو وائس چانسلر کے ڈین ہونے سے فیکلٹی کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ ظاہر ہے۔

اس دفتری خستہ حالی اور کس مپرسی کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ دینیات کے مضمون کی طلباء میں اور اساتذہ میں کوئی وقعت نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نصاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے کرخت لہجہ میں کہا: آپ کو یہ فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا ہے کہ یہ کتاب دینیات کے دائرہ میں نہیں آتی، برٹرنڈ رسل عصر حاضر کا عظیم مفکر، فلسفی اور سائنٹسٹ ہے لیکن ساتھ ہی خدا اور مذہب کا منکر ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ دینیات کے اساتذہ اور طلباء اس کتاب کو پڑھیں اور رسل نے خدا اور مذہب کے انکار کے جو دلائل دیئے ہیں ان پر غور کر کے اس کے جوابات تلاش کریں۔ علاوہ ازیں میں نے بشیر الدین صاحب سے شکایت کی کہ ایک عام بات کہتے کہتے ایک شخص کا معین طریقہ پر نام لینا آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بشیر صاحب میرے بڑے کرم فرما اور دوست ہیں، دوسرے دن انھوں نے مجکو معذرت نامہ لکھا اور میں نے بھی اپنے لہجہ کی کرختگی اور درشتی پر اظہار افسوس کیا، بات آئی گئی ہوئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حیثیت ایک علمی مضمون کی دوسرے شعبوں کے مضمونوں کی طرح نہیں ہے، اس کے امتحانات برائے نام ہیں اور ان میں بڑی فیاضی اور دھاندلی برتی جاتی ہے، طلبا محض اس لئے دینیات لیتے ہیں کہ اس میں تو بے روک ٹوک پاس ہو ہی جائیں گے، علاوہ ازیں اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ بھی تھی کہ دینیات کے اساتذہ ہمیشہ وہ حضرات ہوتے رہے ہیں جو کیسے ہی بڑے عالم فاضل ہوں، لیکن انگریزی میں بولنے اور لکھنے سے عاجز تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے ماحول میں خواہ کوئی مضمون ہو، کوئی استاد انگریزی میں مہارت کے بغیر خاطر خواہ عزت اور وقار حاصل نہیں کرسکتا اور ایسا استاد خود بھی احساس کمتری کا شکار ہونے کے باعث اندر سے گھٹا گھٹا اور یونیورسٹی کی عام سوسائٹی اور اس کی فضا سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرے گا۔

سنی دینیات میں تو دو لکچرر تھے۔ شیعہ دینیات میں صرف ڈیڑھ ہی تھے، اور وہ اس طرح کہ ایک صاحب لکچرر تھے اور دوسرے محض ٹیچر، یہی حال زنانہ کالج کا تھا، وہاں سنی دینیات میں ایک خاتون لکچرر تھیں، لیکن شیعہ میں جو خاتون پڑھاتی تھیں وہ ٹیچرس ہی تھیں، ڈین کی حیثیت سے اب شیعہ دینیات بھی میری نگرانی میں تھا۔ اس بنا پر یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ اور فیکلٹی کے لئے باعث مذلت تھی اس لئے میں نے مذکورہ بالا دونوں جگہوں کو ختم کرا کے ان کی جگہ دو لکچرر مقرر کرائے، کسی کام اور پروگرام کو شروع کرنے اور اطمینان کے ساتھ اسے انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ بیٹھنے کی جگہ تو معقول ہو، اس سلسلہ میں میں نے "ولایت منزل" حاصل کی جو ایک نہایت وسیع کشادہ اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی مضبوط عمارت ہے اور حسن اتفاق سے ایک چھوٹی سی مسجد بھی اس میں بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے حاصل کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ کیونکہ اس پر بہت سے لوگوں کی نگاہ تھی، اگر زیدی صاحب کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو میں اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا، اس عمارت کو اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ کیا، مالیوں کے ذریعہ اس میں خوبصورت لان بنوائے، اور پھلواریاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنوائیں۔ ڈین کے دفتر اور صدر شعبہ کے دفتر دونوں کے لئے الگ الگ فرسٹ گریڈ اور سکنڈ گریڈ کے کلرک اور چپراسی، لائبریری کے لئے اسسٹنٹ اور ایک اٹنڈنٹ حاصل کیے۔

یہ سب کچھ تو فیکلٹی کی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تھا۔ معنوی حیثیت سے نصاب میں تغیر وتبدل کر کے اس کی حیثیت ایک علمی مضمون کی بنائی جو یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ نواب علی یاور جنگ کے زمانہ میں اساتذہ کی ایک میٹنگ تھی اس میں کہیں دینیات کا ذکر آ گیا تو ایک پروفیسر نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے نصاب دینیات کے بعض مشمولات کا تذکرہ کر کے اس کا مذاق اڑایا ایک اور پروفیسر صاحب نے اس پر کچھ اور حاشیہ آرائی کر دی، لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں خود نواب صاحب ان دونوں حضرات کو ان کے نام سے خطاب کر کے بولے: آپ یہ باتیں پرانے زمانہ کی کرتے ہیں۔ اب آج کل ہمارے ہاں جو نصاب رائج ہے آپ اس کو دیکھئے، میں نے بہت غور سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نصاب جامعۂ عثمانیہ۔ حیدرآباد کے نصاب دینیات سے بھی بدرجہا بہتر ہے۔ فیکلٹی کی کلاسوں یعنی بی ٹی ایچ (۲ سالہ) اور ام۔ ٹی ایچ (ایک سالہ) کے نصاب میں یہ تبدیلی کی کہ جو طلبار عربی سے ناآشنا ہوں، ان کے لئے ایک پرچہ عربی کا سو نمبروں کا اور جو طلبار عربی جانتے ہوں ان کے لئے ایک متبادل پرچہ "تاریخ فقہ اسلامی" کا لازمی کر دیا، اور حدیث و اصول حدیث اور فقہ و اصول فقہ کی کتابوں میں ادل بدل کر انھیں اپ ٹو ڈیٹ بنا دیا، علاوہ ازیں ام۔ ٹی ایچ کے نصاب میں ایک مستقل پرچہ "مذاہب کے تقابلی مطالعہ" کا اضافہ کیا۔

نصاب کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر اساتذہ قابل نہیں ہیں تو وہ کسی مصرف کا نہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے فیصلہ کیا (۱) اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ڈپارٹمنٹ کے کاموں اور لکچروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے (۲) ایسے اساتذہ کا تقرر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جائے جو لیاقت و قابلیت کے ساتھ انگریزی میں بھی اعلیٰ سند یافتہ ہوں، علمی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہوں اس سلسلہ میں میں نے اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ جب کبھی کوئی پوسٹ خالی ہو تو اس پر خود فیکلٹی کے اعلیٰ سند یافتہ کا حق بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہے، بشرطیکہ وہ چاہے علامہ نہ ہو۔ پوسٹ کا حق خاطر خواہ طریقہ پر ادا کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہو اس امر کو پیش نظر رکھنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا اور ڈپارٹمنٹ کے حق میں مفید بھی! کیونکہ دینیات کی تعلیم اور اس میں رسرچ پر جس نے عمر کے چھ سات برس صرف کئے ہیں اس کے لئے ملازمت کے مواقع کسی اور یونیورسٹی اور دفتر وغیرہ میں تو ہیں نہیں۔ اب اگر اس غریب کو یہاں بھی موقع نہ ملے تو اس سے طلبا میں بد دلی اور بیزاری پیدا ہوگی۔

بہر حال اس نقطہ نظر اور اس کے ما تحت لگن سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے چارج لیا ہے اس وقت صرف دو استاد تھے، لیکن جب میں نے چھوڑا تو یہ تعداد آٹھ تک پہونچ گئی تھی، پھر ان میں ڈاکٹر یعنی ایم اے پی ایچ ڈی بھی ہیں، قاہرہ کے پڑھے ہوئے بھی ہیں، بلند پایہ اور اعلیٰ کتابوں کے مصنف اور معارف اور برہان کے مقالہ نگار بھی، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی یونیورسٹی کے ایک ڈپارٹمنٹ کا اسٹاف بحیثیت مجموعی سندات، تحریر و تقریر، علمی و تحقیقی کارناموں اور اپنے مضمون پر دسترس کے پیش نظر جتنا اچھا ہو سکتا ہے، یہ اسٹاف اس سے کم اچھا نہیں ہے۔

ایک استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مضمون کو اس طرح پڑھائے کہ طالب علم کے دماغ میں اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو اور یہ چیز دوسرے طلبار کے لئے بھی اس مضمون کی طرف رغبت کا سبب بنے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کی مختلف مجلسوں اور سیمیناروں میں میری زبانی تقریر یا مقالہ تو ہوتا ہی رہتا تھا اب شعبۂ دینیات کے اساتذہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہو کر کبھی اردو میں اور کہیں انگریزی میں مقالہ خوانی اور بحث مباحثہ میں حصہ لینے لگے اور دوسرے شعبوں، یہاں تک کہ سائنس کے اساتذہ کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو مذاکرہ میں شرکت کا موقع ملا تو اب دینیات کے متعلق یونیورسٹی کا جو ذہن پہلے تھا وہ بالکل تبدیل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کے شعبہ میں داخلہ کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، فیکلٹی کی کلاسیں جہاں پہلے ہو کا عالم رہتا تھا وہاں اب چہل پہل رہنے لگی، لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی اور آرٹس کے مضامین کے ساتھ سائنس اور کامرس کے طلبا بھی داخلہ لینے لگے۔ یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں فیکلٹی کے امتحانات اکا دکا کسی نے پاس کر لئے تو خیر، ورنہ اس مضمون میں پی ایچ ڈی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اب لڑکے اور لڑکیاں بھی پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے لگے۔ ان کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا وظیفہ مبلغ -/300 یا یونیورسٹی کا وظیفہ مبلغ -/250 ماہوار تین برس تک کے لئے ملتا تھا۔ جن طلبا ریا طالبات کو پی ایچ ڈی کی ڈگری اب تک مل چکی ہے ان کی تعداد کافی زیادہ ہے ان میں سے جن کے مقالات چھپ چکے ہیں یا اب زیر طباعت ہیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر قاری حافظ محمد رضوان اللہ — مولانا محمد انور شاہ کشمیری۔ حیات اور کارنامے اس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔

(۲) ڈاکٹر حنیفہ رضی — عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے طبع کی ہے

(۳) ڈاکٹر اقبال حسن خاں — شیخ الہند۔ حیات اور کارنامے مطبوعہ مسلم یونیورسٹی

(۴) ڈاکٹر ماجد علی خاں — زندگی کا تصور قرآن اور سائنس میں

یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور لاہور کے شیخ محمد اشرف اسے چھاپ رہے ہیں، مقالہ نگار نے پہلے ایم ایس۔ سی کیا اور پھر فیکلٹی آف تھیالوجی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد مذکورہ بالا موضوع پر دینیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔

پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں نے پانچ چھ برس شعبہ دینیات سے وابستہ رہ کر وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضائع نہیں کیا بلکہ محنت کی اور مضمون میں کمال پیدا کیا وہ کسب معاش میں بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ماجد علی خاں جن کا ذکر ابھی ہوا ٹری نِڈاڈ (Trinidad) کے ایک کالج میں لکچرار اور ڈائرکٹر آف اسلامک اسٹڈیز بھی ہیں۔ مس شفقت فاطمہ جو دینیات کی بہت ممتاز طالبہ رہی ہیں اور جو مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ریسرچ کر رہی تھیں دو برس سے زیادہ سے ٹیونس کے ایک کالج میں اسلامیات کی لکچرر ہیں اور اب آئندہ سال سعودی عربیہ جا رہی ہیں، وہاں تقرر ہو گیا ہے، ایک لڑکی کراچی کے ایک لڑکیوں کے کالج میں دینیات کی لکچرر ہے۔ یہ نام وہ ہیں جنھوں نے تعلیم یہاں پائی مگر اب بیرونی ممالک میں کام کر رہے ہیں، لیکن جو خود ہندوستان میں ہیں اور خوش اور مطمئن ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

یونیورسٹی میں دینیات کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے، لیکن غیر ملکی طلبار سے قطع نظر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے بھی ایسے مسلمان طالب علم کثرت سے آتے ہیں جو اردو نہیں جانتے مگر دینیات لینا چاہتے ہیں، ہر سال ایسے طلبار کی الگ کلاس بنتی تھی اور میں خود اسے انگریزی میں پڑھاتا تھا۔

طلبار کی ایک سوسائٹی تھی جو ہر ڈپارٹمنٹ میں ہوتی ہے، یہ جسدِ بے روح تھی میں نے اس کو فعال و موثر بنایا، اس سوسائٹی کے وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے رہتے تھے جن کے اختتام پر خورد و نوش کا بہترین انتظام ہوتا تھا اور اس میں دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبار بھی شریک ہوتے تھے، اس طرح دینیات کا حلقۂ تعارف واثر وسیع ہوتا تھا، لائبریری کے متعلق میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ لائبریری یونیورسٹی کی چند بہترین ڈپارٹمنٹل لائبریریوں میں سے ہے۔

۱۸، ۱۹ برس پہلے کی بات ہے۔ محب محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دیوبند سے لکھنؤ اور میں کلکتہ جا رہا تھا۔ سفر میں چند گھنٹوں کی معیت ہو گئی، اس موقع پر مولانا نے فرمایا: میرا احساس یہ ہے کہ مدارس عربیہ عمر طبعی کو پہونچ گئے ہیں اور اب دین کی حفاظت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی خدمت کا کام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لینے کا فیصلہ مشیت الٰہی کر چکی ہے، ان حالات میں میری بڑی تمنا اور آرزو ہے (اور میں نے چند حضرات سے اس کا تذکرہ کیا بھی ہے) کہ آپ کو اب کلکتہ سے علی گڑھ بلایا جائے، وہاں آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ مولانا نے یہ بات اس زمانہ میں فرمائی تھی جب کہ علی گڈھ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، لیکن مولانا نے یہ کچھ ایسی ساعتِ نیک میں فرمایا تھا کہ میں علی گڑھ پہونچ ہی گیا۔ البتہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مقصد بھی پورا ہوا یا نہیں؟ کیونکہ مولانا کا مزاج دعوتی اور تبلیغی ہے اور میری طبیعت علمی اور اکتشافی! بہر حال مجکو اس کی مسرت ہے کہ زیدی صاحب جن کے دل میں دینیات کے شعبہ کی بیکسی کا بڑا غم تھا اور جس کا وہ اکثر اظہار فرماتے رہتے تھے، ان کا مقصد پورا ہو گیا، چنانچہ جب میں علی گڑھ سے سبکدوش ہو کر دلی آیا ہی تھا ایک روز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز کی ایک میٹنگ تھی اس میں زیدی صاحب نے پروفیسر خلیق احمد نظامی، پرنسپل فاروقی اور پروفیسر مجیب کی موجودگی میں مجھ سے مخاطب ہو کر اپنے خاص لہجہ میں زور دیکر فرمایا: "اگر میں وہاں ہوتا تو ابھی آپ کو پانچ برس اور علی گڑھ سے نہ جانے دیتا[1]۔"

---

[1] اس میں شک نہیں کہ فیکلٹی آف تھیالوجی کی ترقی سے متعلق جو منصوبہ اور خاکہ میرے ذہن تھا میں اس کی کما حقہ تکمیل نہیں کر سکا اور اس کی حسرت ہی رہ گئی، مجھے ان طلبار کی طرف سے سخت صدمہ پہونچا جن کو میں نے ڈھائی سو تین سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ دلایا اور وہ مقالہ کی تکمیل کیے بغیر چل دیے، ان نوجوانوں کی اس سہل انگاری اور ژولیدہ دماغی نے میری ہمت توڑدی اور بعض منصوبوں کو خود مجھے مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اور جو کچھ میں کر سکا ہوں اس کے لئے اپنے رفقائے کار اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار و انتظام، خصوصاً وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور اکاڈمک و اکزیکٹو کونسل کا دل سے شکر گذار ہوں:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

© rasailojaraid.com